ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



# اس چمن میں سراپا سوز و سازِ آرزو (آرزو: کلامِ اقبال کا اہم فکری ماخذ)

**ڈاکٹر قیصر محمود**
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی زبان وادب، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
qaiser.mehmood@uos.edu.pk

**محمد عامر سہیل**
لیکچرار، شعبہ اُردو زبان وادب، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا
muhammad.amir@uos.edu.pk

**Abstract**
*In Iqbal's intellectual framework, 'Arzoo' (Desire) is not merely a psychological state but a driving force that keeps a human being actively engaged. The awakening of desire is inevitable before achieving any goals or destinations. An individual devoid of desire falls victim to stagnation and inertia. The 'burning of desire' (Sowz-e-Arzoo) is essential for Self-awareness, understanding the universe, and attaining closeness to God. Desire keeps a person restless, anxious, and dynamic. In Iqbal's prayers, intellectual trends, and concepts, desire emerges as a fundamental source. Iqbal rejects 'stingless' and static desire; instead, he advocates for a 'living desire' that creates restlessness and passion in the heart, thereby inciting action. The construction and stability of the Self (Khudi), the attainment of the Falcon's (Shaheen) high flight and vision, the foundation of national awakening, the cultivation of divine attributes in a Believer, and the essence of Love (Ishq) all stem from this very desire. It is a great desire that elevates humans from lowliness to greatness. Desire negates passive contentment and silence, keeping humans in a state of continuous motion. Iqbal's message, his aspirations, and the demands arising from his poetry encompass his philosophy of desire. This paper attempts to understand Iqbal's philosophy of desire through his Urdu poetry and explores how it serves as the foundational source of his intellectual system.*

**Keywords:**
Concept of Desire, Passion of Action, Invocations, Spark of Desire, Philosophy of Self, The Ideal Believer, Falcon, Concept of Love, Inner Vision

فکرِ اقبال کا بنیادی محور ''عرفان'' ہے۔ اقبال کے نزدیک ''عرفان'' کا حصول ''آرزو'' کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آرزو وہ ابتدائی قدم ہے جو انسان خود شناسی، کائناتی دریافت، فعالیت پسندی اور عملی زندگی کی طرف جانے کو اٹھاتا ہے۔ شعر اقبال کا دائرہ پیغام تک محدود نہیں بلکہ یہ وہ فکری نظام ہے جو نوجوان فرد، مرد اور مومن میں امید، عمل، تمنا اور آرزو کو بیدار کرتا ہے۔ وہ اطمینان کو ایک طرح سے جمود خیال کرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں اضطراب، بے چینی اور جستجو سے ہی تحرک پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ فلسفہ قناعت سے اختلاف اور حیات کے حرکی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہم اقبال کے پیغام، انقلابی افکار، تصورات اور مناجات میں ان کے "فلسفہ آرزو" کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو اُن کے تمام سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ افکار کی اساس ''آرزو'' پر قائم ہے۔ اس مقالے میں اقبال کے فکری نظام میں ''فلسفہ آرزو'' کے کردار کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کی اردو شاعری سے مثالیں لا کر ان کے ''فلسفہ آرزو'' کی تفہیم و تعبیر کی گئی ہے۔

عمومی طور پر آرزو، خواہش اور تمنا کو ایک ہی مفہوم میں بیان کیا جاتا ہے۔ تاہم ان الفاظ میں معنوی حوالے سے ایک باریک سا فرق ضرور موجود ہے۔ آرزو، فارسی سے ماخذ ہے۔ جس کے لغوی معنی امید، تمنا، آس، اشتیاق کے ہیں۔ اس میں امید اور جذبے کی کیفیت ہے۔ خواہش، فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی چاہتا، طلب کرنا، مرضی اور ارادہ کے ہیں۔ اس میں عمومی انداز میں ضرورت کی کیفیت نظر آتی ہے۔ تمنا، عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی لاحاصل چیز کی خواہش کرنا، جس میں تڑپ اور انتظار کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں 'آرزو'

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



کی فطرت میں سوز، آگ اور تڑپ دکھائی دیتی ہے۔ جو ان کے فکری نظام کی 'اساس' بن گئی ہے۔ 'آرزو' اس قدر اُن کے فکری نظام میں اہم ہے کہ وہ اسے اپنا آخری رفیق سمجھتے ہیں۔ ''راہ محبت میں ہے کون کس کا رفیق/ساتھ مرے رہ گئی ایک مری آرزو''۔ عشق (بڑا مقصد) کے راستے میں سب چھوڑ کر چلے جائیں تب بھی اگر کوئی ساتھ نبھائے تو وہ اقبال کی 'آرزو' ہے۔ یہ وہ عظیم آرزو ہے جو قوی اور مستحکم ہے۔

سوال یہ ہے اقبال کیسی آرزو کے خواہش مند ہیں۔ اس کا دائرہ کار کیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اقبال کے نظامِ فکر کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ فکری نظام اس دور کے سیاسی حالات، سماجی تناظرات اور مذہبی عقائد سے الگ نہیں ہے۔ اقبال چوں کہ روحانیت، خودداری، عمل پیہم، حریت، قومیت (وطنی و مذہبی تصور)، آزادی، انقلاب اور مسلمان کی سربلندی چاہتے ہیں، اس لیے ان کی "آرزو" کا تعلق مذکورہ تصوراتِ اقبال میں پنہاں ہے۔ بانگ درا کی نظمیں ''بچے کی دعا'' اور ''دعا'' مناجاتی اسلوب رکھتی ہیں۔ یہ اقبال کی اس حقیقی آرزو کا احاطہ کرتی ہیں جس پر آگے چل کر اقبال کا نظامِ فکر جنم لیتا ہے۔ اقبال نے بچے کی دعا کو انفرادی سطح سے اٹھا کر اجتماعی حوالوں تک پھیلا دیا ہے۔ جس میں ذاتی مفاد سے زیادہ کمزوروں، ناتوانوں، دردمندوں، حاجت مندوں اور ضعیفوں کی خیر خواہی اور نصرت کی آرزو ہے۔ روشن حیات، خود جلنا مگر دوسروں کے لیے روشنی مہیا کرنا، وطن کے لیے باعثِ فخر ہونا، علم سے عشق، نیک راہ پر چلنا اور برائی سے بچنے کی آزرو ایک بچہ کر رہا ہے۔ وہ رب تعالیٰ سے مخاطب ہے اور عملی و مقصدی زندگی کی خواہش اس کے دل میں ہے۔ وہ اپنے کردار میں اخلاق و خدمت اور افکار میں روشن ضمیری و حب الوطنی کا متمنی ہے۔ نظم ''دعا'' میں اقبال رب تعالیٰ سے خود مخاطب ہو کر دلِ مسلم کے لیے 'زندہ تمنا' کی آرزو کرتے ہیں۔ جو دل کو حرارت اور روح کو تڑپا دے۔ زندہ تمنا، صرف خیال کا اظہار نہیں بلکہ یہ عمل کی طرف راغب کرتی ہے۔ اس نظم کا فلسفہ 'احیائے امت' اور 'روحانی انقلاب' ہے۔ اقبال اس نظم میں سوز، تڑپ، تقاضا، شوق، داغِ محبت، صورتِ مینا اور اندیشہ فردا کی آرزو کرتے ہیں۔ اقبال کا ماننا ہے کہ جذبوں میں کمی، عمل میں ٹھہراو اور حرکت میں جمود 'مردہ تمنا' کے باعث آتا ہے۔ 'زندہ تمنا' میں انسان مسلسل جدوجہد میں فنا ہو جاتا ہے۔ بانگ درا میں شامل ابتدائی نظم ''گل رنگیں'' کا ایک شعر ہے۔

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو — اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو (۱)

یہاں اقبال اپنی ذات اور اپنے عہد کے نوجوان میں 'آرزو' کے ہونے نہ ہونے کا تقابل کرتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی سرتاپا 'آرزو' کے سوز و ساز میں غرق جبکہ نوجوان کی زندگی گداز کی حامل 'آرزو' سے تہی نظر آتی ہے۔ غور کریں تو اقبال کی آرزو ہے کہ آج کے نوجوان میں 'آرزو' افقی اور عمودی دونوں سطح پہ پیدا ہو۔ جس میں 'گداز' ہو۔ تاثیر اور درد ہو۔ نظم ''چاند'' میں اقبال اپنا تقابل 'چاند' سے کرتے ہیں۔

یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں — عشق ہے تُو کسی کا، یہ داغِ آرزو ہے
میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تُو فلک پر — تجھ کو بھی جستجو ہے، مجھ کو بھی جستجو ہے (۲)

چاند کے سینے پر ''داغِ آرزو'' (زخم) عشق میں ناکامی یا شدتِ خواہش کا اعلان کرتا ہے۔ یہاں چاند محض ایک سیارہ نہیں بلکہ حساس اور زندہ کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اقبال اور چاند میں 'آرزو'' کا اشتراک ہے۔ جو انھیں بے چین، مضطرب اور بے تاب رکھے ہوئے ہے۔ اگرچہ دونوں مکانی طور دو انتہاؤں پر موجود ہیں، ایک انسان ہے دوسرا سیارہ ہے۔ مگر دونوں میں کسی کو پانے کی جستجو برابر ہے۔ اقبال کے نزدیک 'آرزو' چاند کی طرح ہو، جس میں مسلسل حرکت ہو، بے چینی اور بے تابی ہو۔ شاعر کے دل میں آرزو کا داغ ہے۔ جو سوز سے پیدا ہوا ہے۔ غرض شاعر اور چاند دونوں میں آرزو کا داغ ہے۔ سرگرم سفر و عمل ہیں۔ کسی کی تلاش میں ہیں۔ یہاں جمود اور سکوتب کی نفی کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ تاہم 'داغ' عیب کے معنوں میں نہیں استعمال ہوا۔ بلکہ اقبال کے نزدیک:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



ع دواہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا(۳)

یہاں تک کہ اقبال ہر دکھ کی دوا 'مجروحِ تیغِ آرزو' کو قرار دیتے ہیں۔ چھوٹے دکھوں کو پالنے اور مسائل میں گھرے رہنے سے بہتر ہے کہ انسان کسی عظیم مقصد کی آرزو اپنے دل میں پیدا کر کے اس پر عمل شروع کر دے۔ آرزو کی تلوار سے زخمی رہنا اصل میں زندہ تمنا کی علامت ہے۔ یہ اس امر کا اظہار ہے کہ انسان سکوت نہیں حرکت میں رہے۔ اپنے دلوں میں ایسی تمنا اور آرزو پیدا کر لیں جو مضطرب رکھے۔ جس کا نتیجہ ستاروں پر کمند ڈالنے، مادی کائنات پر تصرف پانے اور دنیا کی امامت کا حصول ہے۔ مزید وہ بتاتے ہیں کہ کیسی آرزو پیدا کی جائے:

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کرو لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لیے(۴)

یہ ایک عظیم اور بلند مگر طاقت ور آرزو کی خواہش ہے۔ جس کو آسماں (دشمن/مصائب) کی طاقت بھی ختم نہ کر سکے۔ اقبال ایسی آرزو کو نوجوانوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہاں آرزو میں ایک مزاحمتی کیفیت نظر آتی ہے۔ جس میں مقابلہ کی قوت اور استحکام کی طاقت ہو۔ تقدیر پر تدبیر کے غلبے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ حوصلہ افزا پہلو ہے اگر آرزو بلند ہو، عظیم مقصد کی جستجو ہو، عشق کا ساتھ ہو، حق کی بات ہو اور سچائی کی آرزو ہو تو اس کو کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی۔

سوال ہے کہ آرزو کیسے پیدا ہو سکتی ہے، اس کے لیے اقبال ساقی (اللہ کی ذات) سے مخاطب ہوتے ہیں کہ وہ پردہ سے عیاں ہو، نورِ خدا کی تجلی کا تماشا ہو جس سے حرم کے دل میں "سوزِ آرزو" پیدا ہو۔

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی (۵)

''سوزِ آرزو'' بڑا مقصد ہے۔ ایک نظر مسلمانوں کے تابناک ماضی کی طرف دوڑائیں تو موجودہ عہد میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ کر اقبال کی آرزو عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ مسلمانوں میں وہی تڑپ، شجاعت، دلیری، بہادری اور یک جہتی دیکھنا چاہتے ہیں جو اسلاف میں تھی۔ جس کے سبب مسلمان حکمران تھے۔ آج ''سوزِ آرزو'' سے تہی ہیں اور مغلوب ہیں۔ اقبال اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر ان سے دیدار کی طلب کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں میں وہی ''سوزِ آرزو'' جنم لے۔ ملت اسلامیہ پر زوال کا خاتمہ اور عروج کا دور شروع ہو۔ اقبال کے نزدیک ''سوزِ آرزومندی'' اس قدر اہم ہے کہ وہ اسے 'متاعِ بے بہا' تصور کرتے ہیں۔ آرزو کو دولت قرار دیتے ہیں جو بقول اقبال انھیں عبدیت سے میسر آئی ہے۔ سوزِ آرزو اور مقام بندگی لازم ملزوم ٹھہرتے ہیں۔ دونوں کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ان کا تقابل شانِ خداوندی سے کرتے ہیں۔

متاعِ بے بہا ہے دَرد و سوزِ آرزومندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی (۶)

جو دولت (دَرد و سوزِ آرزومندی) انھوں نے بندگی سے حاصل کی ہے، وہ انھیں شان خداوندی سے زیادہ عزیز ہے۔ بندگی میں عجز ہے، فقر ہے، نیاز مندی ہے۔ یہی ایک انسان اور مومن کی معراج ہے۔ اسے اقبال خدائی صفت (بے نیازی) پر ترجیح دے کر اپنے لیے مقام عبدیت پسند کرتے ہیں جس سے "سوزِ آرزو" پائی ہے۔

آرزو، ایک لطیف انداز میں کسی چیز یا شے کی خواہش کرنا ہے۔ کسی مقصد کے لیے دل میں تمنا کا بیدار ہونا ہے۔ جس قدر آرزو میں شدت کی کیفیت ہو گی اسی قدر عمل کا جذبہ قوی ہو گا۔ ناامیدی، آرزو کو کمزور کرتی ہے۔ یہ صورت بے عملی کے خدشے کو بڑھاتی ہے۔ خود شناسی، خدا شناسی اور کائنات شناسی تینوں منازل کے راستے میں امید کا سہارا چاہیے۔ اقبال کے نزدیک 'آرزو' کی ضرورت و اہمیت ''خضرِ راہ'' کے ایک شعر سے عیاں ہو جاتی ہے۔

مسلم استی، سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر 'لایخلف المیعاد' دار (۷)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



اقبال دلِ مسلم کو اعلیٰ وارفع آرزو سے سرشار دیکھنا چاہتے ہیں۔ باری تعالیٰ پر مومن کے یقین مستحکم کو رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ اول؛ آرزو کا پیدا ہونا۔ دوم؛ خدا کی وعدہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ یہاں آرزو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے راستہ بن جاتی ہے۔ انسان منزل کے حصول کی امید کے ساتھ عمل، جستجو اور تگ و دو کی طرف راغب ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں آرزو کی قدر و منزلت اسی امر سے ظاہر ہوتی ہے۔ "طلوعِ اسلام" میں باری تعالیٰ سے مناجاتی انداز اختیار کرتے ہیں۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے　　چمن کے ذرّے ذرّے کو شہید جستجو کر دے (۸)

'لالہ' کا استعارہ مسلمان کے لیے برتا گیا ہے۔ اقبال جس کے ضمیر میں آرزو کے چراغ جلانے کی دعا مانگ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں آرزو کے بغیر انسانی ضمیر تاریک ہے۔ آرزو، روشنی ہے جو دلِ مومن کو زندہ رکھتی ہے۔ آرزو، انسان کو مضطرب رکھتی ہے۔ کیوں کہ اضطراب ہی انسان کو آگے بڑھنے اور فعال کردار ادا کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ اقبال دعا گو ہیں کہ چمن (وطن) کے ذرہ ذرہ (ہر مسلمان) کو وطن کی آزادی کے حصول کے لیے آخری حد تک کوشش کرنے والا بنا دے۔ وہ اپنے مقصد میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ ان کی آرزو فقط آزادی وطن ہو۔ اس کے لیے وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ مبادا غلطی ہو، اقبال کسی ایک مقصد تک محدود رہنے کی آرزو نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسان مسلسل اعلیٰ مقاصد اور بہتر سے بہترین کی طرف سرگرم عمل رہے۔ یہیں ہم فکر اقبال کی معراج دیکھتے ہیں کہ جہاں اقبال روایتی تصوف (قناعت پسندی) سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ مسلسل جدوجہد کا درس دیتے ہیں۔ رازِ حیات جاننے اور کائنات کو مسخر کرنے کے آرزو مند ٹھہرتے ہیں۔

''اِبلیس کی مجلسِ شُوریٰ'' میں ابلیس کو اس کے مشیر اشتراکیت (مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں) اور جمہوری نظامِ سیاست سے آگاہ کرتے ہیں، جو اُن کے پھیلائے شیطانی نظام (سرمایہ داریت / استحصالی نظام) کو تباہ کر سکتا ہے۔ ابلیس اس سے ڈرنے سے منع کرتا ہے۔ وہ اس خطرے کا اندیشہ ظاہر ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی خاکستر میں ''شرارِ آرزو'' موجود ہے۔ کسی وقت یہ چنگاڑی بن کر ہمارے شیطانی نظام کو جلا دے گی۔ یہاں 'شرارِ آرزو' سے مراد وہ ایمانی حرارت ہے جس سے ابلیسیت کا خاتمہ ممکن ہے۔ یہ آرزو کی طاقت ہے جس سے ابلیس بھی خوف کھاتا ہے۔ ابلیسی طاقت بمقابلہ ایمانی طاقت دیکھیں تو ایمان کی طاقت غالب نظر آتی ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اُس اُمت سے ہے　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو(۹)1085

اب وقت آ گیا کہ اس 'شرارِ آرزو' کو چنگاڑی بن جانا چاہیے۔ اس کے لیے اقبال، اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے ہیں۔ فکرِ اقبال میں ساقی سے مراد ''حقیقت مطلق'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ 'ساقی نامہ' میں وہ ساقی سے مخاطب ہو کر اُسے مسلمانوں کے حال سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ امت روایات میں کھو گئی ہے، جمود کا شکار ہے، کاہلی اور سستی میں غرق ہے۔ اس سے نکل کر مسلسل جدوجہد اور حریت پسندی کی طرف مائل ہو۔ مسلمانوں میں عشق کی آگ بجھ چکی ہے۔ راکھ بن چکے ہیں۔ ایسی نازک اور زوال پذیر صورت حال میں اقبال، ساقی سے آرزو کرتے ہیں:

شراب کہن پھر پلا ساقیا　　وہی جام گردش میں لا ساقیا!
مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا　　میری خاک جگنو بنا کر اُڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر　　جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے　　نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے　　دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر　　تمنا کو سینوں میں بیدار کر (۱۰)

شراب کی چاہت، جس سے حقیقت کی معرفت نصیب ہو۔ عشق کی طلب، جو خودی کی تکمیل میں معاون ہو۔ آزادیِ خرد کی تمنا، جس سے مسلمان مغرب۔ جوانوں میں اُن بزرگوں رہبری کی خواہش، جو جمود اور روایات کا شکار ہیں۔ اقبال نوجوانوں میں خودادی، سخت کوشی، بلند پروازی، تخلیقی صلاحیت، تقلید سے دوری، آہِ سحَر گاہی، تدبر، علم سے عشق، غیرت و حریت اور آزادیکی تمنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا نوجوان 'صاحب آرزو' ہے۔ ایک خط میں اکبر الٰہ آبادی کو لکھتے ہیں:

> ''صرف ایک بےچین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے۔ جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔''(۱۱)

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق، شجاعتِ حیدری اور سوزِ صدیق کی آرزو اقبال کے ہاں شدت اختیار کر جاتی ہے۔ اقبالی ایمان ہے کہ یہ تمام اختیارات مالک حقیقی کے پاس ہیں، اسی کے کرم سے دلِ مرتضیٰ (جلالِ حیدری) اور سوزِ صدیق (جمالِ صدیقی) نصیب ہو سکتا ہے۔ جگر سے تیر پار ہونا، یعنی عشق کی کاری ضرب ہے۔ تمنا کا سینوں میں بیدار ہونا، جو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ اقبال ایسی 'عظیم آرزو' کے تمنائی ہیں۔ بقول اسلوب احمد انصاری ''تمنا، سوزِ جگر، عشق اور نظر کو اقبال حقائق کے انکشاف کا موثر ترین وسیلہ مانتے ہے۔''(۱۲)

نظم ''ایک آرزو'' ان کے ابتدائی دور کی رومانیت اور فطرت پسندی کا اظہاریہ ہے۔ اس میں وہ دنیا کی محفل میں پائے جانے والے شورش گھبرا کر "فطرت کی آغوش" میں جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ ہنگامہ آرا زندگی جس نے مادیت کو روحانیت پر اور عقل کو عشق پر ترجیح دی ہے؛ اقبال اسے پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی محفل سے اکتا کر عالمِ خلوت کی تمنا کرتے ہیں۔ ان کا عالمِ خلوت روایتی صوفیانہ منشا سے مختلف ہے۔ اس میں انسانی ہنگامہ خیزی نہیں بلکہ فطرتی مظاہر ہیں۔ جن میں پہاڑ، ندی نالے، چشمے، بلبل، چڑیاں، پھول، کوئل اور شبنم شامل ہیں۔ اقبال وہاں جا کر معبود کی "بندگی" بجالا کر جو "آرزو" خدا کے حضور پیش کرتے ہیں؛ وہی ان کا بنیادی مقصد ہے۔

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے　　تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے　　بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید انھیں جگا دے (۱۳)

اقبال خلوت پسندی میں آرام طلبی نہیں بلکہ عالم سکوت میں اپنی آواز کو "ستاروں کے قافلے" کے لیے بانگ درا کی آرزو کرتے ہیں۔ جس طرح گھنٹی کی آواز قافلے کو سیدھے راستے پر چلاتی ہے اور سوئے ہوؤں کو جگاتی ہے، اسی طرح میری آواز کائنات کے نظام میں ہلچل مچا دے اور میری فریاد آسمان والوں تک پہنچ جائے۔ یہاں "بانگ درا" کا تصور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال غفلت، قناعت، بے عملی، آرام کوشی اور خلوت نشینی کو رد کرتے ہوئے قوم کے لیے تحرک، فعالیت، جستجو اور تلاش کی آرزو کرتے ہیں۔ "بیداری" اقبال کی آرزو بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

اقبال ایسی آرزو کے متمنی ہیں جس میں نیش (Sting/Prick) ہو۔ تاکہ انسان مضطرب رہے، تسلسل میں رہے۔ جو زندہ آرزو کی دلیل ہے۔ جب تک انسانی آرزو میں بے چینی رہے گی، تب تک تحرک رہے گا۔ آرزو میں نیش کا خاتمہ، سستی اور کاہلی کو جنم دے گا۔ جو اقبال کے ہاں قابل قبول نہیں۔

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا　　ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی (۱۴)

اقبال آرزو کی بے نیشی کو مرض قرار دیتے ہیں۔ یہاں ان کا اشارہ قناعت پسندی، اطمینان، بے عملی اور غیر فعالی انداز کی طرف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آرزو میں نیش رہے، جس سے تمناؤں، خواہشوں اور کچھ کر گزرنے کی لگن مسلسل جاری رہے۔ آرزو میں "نیش" کو عشق بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہاں سے ان کا نظریہ خودی، تصور عشق اور فلسفہ آرزو آپس میں مل جاتے ہیں۔

خودی اگر جسم ہے تو آرزو اس کی جان ہے۔ خود شناسی کا عمل 'آرزو' سے شروع ہوتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ راز حیات جانے اور خود آگاہی حاصل کرے۔ وہ کیا ہے، کیوں ہے، کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، کیا بنے گا، کائنات میں اس کا مقام کیا ہے، اس کی ذمہ داری کیا ہے، مقصد تخلیق انسان و کائنات کیا ہیں؟ یہ سوالات ہیں جو انسان کو اپنے آپ سے نہ صرف کرنے چاہئیں بلکہ ان کے جوابات کی جستجو کرنی چاہیے۔ اقبال اس کی آرزو کرتے ہیں کہ انسان، نوجوان، اور مسلمان اس امر پر غور کرے۔ خودی، آرزو کے بیج سے نمو پاتی ہے۔ آرزو، چراغ ہے جس کی حرات سے خودی کی منازل طے ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی' خودی' ان کی بے حسی اور سہل پسندی کی نذر ہو گئی تھی۔ اقبال اس کھوئی ہوئی چیز (خودی) کی آرزو کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| فطرت کو خِرد کے رُو برو کر | تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر |
| تُو اپنی خودی کھو چکا ہے | کھوئی ہوئی چیز کی جستجو کر |
| تاروں کی فضا ہے بیکرانہ | تُو بھی یہ مقام آرزو کر (۱۵) |

ان اشعار سے اقبال کے فلسفہ حیات کے تین بنیادی ستون: تسخیر کائنات، عرفانِ ذات اور عظیم آرزو واضح ہوتے ہیں۔ مومن، نائب خدا ہے۔ وہ رہبانیت سے انکار کر کے خدا کی کائنات پر قابو پا کر اس پر حکمرانی کرتا ہے۔ آفاق میں گم نہیں ہوتا بلکہ آفاق پر قبضہ کرتا ہے۔ اقبال اس خودی کی جستجو بیدار کرنے کی آرزو کرتے ہیں جو مسلمان میں ایمانی قوت، سائنسی شعور، فنِ حرب، علمی کمالات، تاریخ اور ہنرِ شہنشاہی کی بازیافت کرے، جنھیں وہ بھول گیا تھا۔ نظم ''ذوق و شوق'' میں وا پنی غزل (شاعری) کو 'آتش رفتہ کا سراغ' اور اپنی سر گزشت کو 'کھوئے ہُوؤں کی جستجو' قرار دیتے ہیں۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان آرزو کا وہ مقام حاصل کرے جیسے ستاروں میں بلندی اور وسعت (افقی و عمودی) ہے۔ تاہم یہ رسائی ستاروں تک محدود نہ رہے بلکہ اقبال کے ہاں آرزو کی کوئی انتہا سرے سے موجود نہیں۔ اُن کے نزدیک 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'۔ مسلمان کی آرزو عظیم، بلند اور وسعت کی حامل ہو۔

تصور عشق اور فلسفہ آرزو اقبال کے فلسفہ خودی کے دو بنیادی ستون ہیں۔ ان دونوں میں تخلیقی قوت، خودی کی تعمیر، مسلسل کوشش، انتہائے جستجو اور جذبے کی شدت ہے۔ انتہائے آرزو، معراج عشق ہے۔ آرزو جس راستہ پر روشنی ڈالتی ہے، عشق اس پر چل کر منزل تک پہنچتا ہے۔ عشق سے پہلے آرزو کا مقام ہے۔ یوں یہ لازم ملزوم بن جاتے ہیں۔ جن کے باہم امتزاج سے "مرد مومن" کی تشکیل ہوتی ہے۔ مرد مومن کے دل میں آرزو کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو وہ چل پڑتا ہے۔ عشق اس کا ہمراہی ہوتا ہے۔ منزل آسان ہو جاتی ہے۔ وہ کسی طاقت سے بلا خوف و خطر اپنی منزل تک مسلسل رواں دواں رہتا ہے۔ وہ سکوت سے نکل کر تحرک میں جیتا ہے۔ اس میں قلندرانہ صفات جنم لیتی ہیں۔ وہ قناعت پسندی کے بجائے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر رازِ حیات و کائنات پہچانتا ہے۔ اقبال، دنیاوی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مرد مومن کا تصور لاتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد مومن کی تشکیل میں آرزو کا کیا کردار ہے۔ بے عملی کا شکار محض ذکر و اذکار کرنے والا اقبال کے نزدیک مرد مومن نہیں ہے۔ وہ مرد مومن میں تحرک دیکھتے ہیں۔ یہ تحرک اور کائنات کو مسخر کرنے کی لگن کے پیچھے آرزو ہی کا جذبہ کار فرما ہے۔ مرد مومن جس میں خودی مستحکم ہو چکی ہے۔ اس خود کو آرزو ہی بیدار کرتی ہے۔ یہ آرزو اسے جہان نو کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ موجود سے زیادہ نئ

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



دریافتوں پر یقین رکھتا ہے۔اس کے وجود میں اطمینان کی جگہ اضطراب رہتا ہے۔دوسروں کے سہارے چھوڑ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔محتاج نہیں خلاق بن جاتا ہے۔مرد مومن میں ذوق یقین پیدا ہو تو تمام زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔یہ اس کی آرزو ہی ہے جو اسے ذوق یقین کی طرف لے جاتی ہے۔پھر اس کی نگاہ میں بصیرت کا وہ مقام آجاتا ہے کہ تقدیریں بدل جاتی ہیں۔مرد مومن "خدا کا ترجماں" بن جاتا ہے۔وہ خود کار ازداں ہوتا ہے۔ اقبال ایسے مرد مومن کی آرزو کرتے ہیں۔جس میں بندگی، خودداری، خدا کی ترجمانی اور بوئے اسد الٰہی ہو۔مومن اور کافر میں فرق بیان کرتے ہیں۔کافر، آفاق میں گم ہے جبکہ مومن میں آفاق گم ہیں۔یہ بڑا گہرا نقطہ ہے۔اقبال مسلمان میں یہ آرزو بیدار کرتے ہیں کہ وہ دنیاداری (مادیت) میں نہ کھو جائے بلکہ اس کائنات کو اپنے تابع کرے، اور اس پر حکمرانی کرے۔مومن خدائی صفات رکھتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن　　گفتار میں، کردار میں، اللہ کی بُرہان!
قہاری و غفاری و قدوسی جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان (۱۶)

اقبال ایک مسلمان میں ان صفات کو دیکھنے کے آرزومند ہیں۔اس کے بعد وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنے کے بجائے سربلند ہو کر زندگی گزار سکتا ہے۔مرد مومن، آرزو سے مقصد تخلیق کرتا ہے۔عشق کا جذبہ اسے حرارت مہیا کرتا ہے۔خودی اس کی طاقت بن جاتی ہے۔ایمان اور یقین اسے اس قدر مضبوط بنا دیتے ہیں کہ وہ فطرت، کائنات، دنیاوی خواہشات اور غیر اللہ پر حکمرانی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اقبال کا تصور شاہین، انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔شاہین کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔اس کا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں میں ہے۔ اس کی اُڑان افقی و عمودی دونوں اطراف میں قابلِ رشک ہے۔خود پر انحصار کرتا ہے۔اپنا شکار خود کرتا ہے۔اپنا جہاں الگ بناتا ہے۔اقبال کی نظر میں شاہین کی صفات میں بلند پروازی، تیز نگاہ، خود انحصاری، قوتِ قاہرہ (فتح پانا)، غیرت، خلوت نشینی، حرکت و تسلسل اور اضطراب شامل ہیں۔یہی صفات وہ نوجوانوں میں دیکھنے کی آرزو کرتے ہیں۔آرزو میں بلندی، حرکت، تسلسل، سوز اور جستجو کا ہونا اسے اقبال کے تصور شاہین سے جوڑتا ہے۔ شاہین، میں سکوت نہیں مسلسل جدوجہد میں رہتا ہے۔اس کے سامنے آسماں کی وسعتیں ہوتی ہیں۔پرندوں کی دنیا کا درویش اور سلطان ہے۔وہ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں بلکہ نئے جہانوں کی دریافت کرتا ہے۔نظم ''شاہیں'' کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں:

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب، یہ پچھم چکوروں کی دُنیا　　میرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دُنیا کا درویش ہوں میں　　کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ (۱۷)

اقبال کی مناجات، تصورات، فلسفیانہ افکار اور سیاسی نظریات میں ''آرزو'' کا کلیدی کردار ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ چراغِ آرزو ہر راہ کو منور کرتا ہے۔ان کے ہاں آرزو روحانیت تک محدود نہیں بلکہ اس کی سرحدین مادی کائنات کو سمجھنے اور اسے مسخر کرنے تک پھیلی ہوئی ہیں۔آرزو وہ تڑپ اور حرارت ہے جو انسان کو مسلسل متحرک رکھتی ہے۔اس میں قناعت و اطمینان کا پہلو نہیں ہے۔اقبال بیداریِ قوم، چشمِ تماشا، نورِ حقیقت، نورِ بصیرت، ساحل، تسخیر کائنات، اعلیٰ مقاصد، دلِ مضطرب، ترجمانِ خدا، سوزِ آرزو، حیاتِ جاوداں، اسرارِ حیات و کائنات، حریمِ کبریا سے آشنائی، زندہ تمنا، علم سے محبت، نیک راہ، دیدہ بینا، شوق تماشا کی آرزو کرتے ہیں۔'آرزو' دل میں خیال کی پیدائش کا نام نہیں بلکہ یہ علم اور عمل کے ذریعے اس آرزو تک پہنچنے کا نام ہے جو اقبال کی آرزو ہے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



خدایا! آرزُو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبال کے ہاں 'نورِ بصیرت' علم، دل اور عشق کی روشنی ہے۔ اسی میں حقیقت کو پانے کی جستجو ہے۔ وہ دل (دلِ بینا بھی خدا سے کر طلب) کی آنکھ سے دیکھنے کے طالب ہیں۔ نورِ بصیرت ایسی قوت ہے جو تقدیر پر غلبہ پانے کی طاقت رکھتی ہے۔ نگاہِ پاک، اقبال کے ہاں روحانی بصیرت کا نام ہے۔ ایسی آرزو اقبال ایسا شاعر ہی خدا سے کر سکتا ہے۔ کلامِ اقبال (اُردو) کے مطالعہ سے اقبال کا 'فلسفہ آرزو' اُن کے جملہ افکارِ عالیہ اور فکری رجحانات کی کلید نظر آتا ہے۔ اقبال کے فکری نظام کہ تفہیم و تعبیر سے قبل ان کی منشا، تمنا اور اضطراب کو سمجھنا چاہیے جو اُن کے 'فلسفہ آرزو' کا بنیادی حوالہ ہے۔ اقبال کے فکری نظام کے اہم ماخذ کے طور پر ابتدا میں آرزو فطرت کے نظاروں میں کھو کر سکون پانے اور نالے بلند کرنے کی، پھر خود آگاہی اور بیداری قوم کی آرزو جبکہ آخر میں آرزو تسخیر کائنات اور زمین پر خدا کے نائب ہونے کا حق ادا کرنے تک پہنچ گئی۔

☆☆☆☆☆

## حوالے


۱۔ محمد اقبال، علامہ۔ کُلیاتِ اقبال (اُردو) (لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۲ء)، ص: ۲۹۔
۲۔ محمد اقبال، علامہ۔ کُلیاتِ اقبال (اُردو)، ص: ۳۰۴۔
۳۔ ایضاً، ص: ۱۱۹۔ ۴۔ ایضاً، ص: ۱۶۸۔ ۵۔ ایضاً، ص: ۵۴۸۔
۶۔ ایضاً، ص: ۵۵۴۔ ۷۔ ایضاً، ص: ۴۷۰۔ ۸۔ ایضاً، ص: ۴۷۸۔
۹۔ ایضاً، ص: ۱۰۸۵۔ ۱۰۔ ایضاً، ص: ۷۴۵۔
۱۱۔ عطااللہ، شیخ۔ اقبال نامہ یعنی مجموعہ مکاتیب، حصہ دوم (لاہور: شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری، ۱۹۵۱ء)، ص: ۴۹۔
۱۲۔ اسلوب احمد انصاری، اقبال کی تیرہ نظمیں (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)، ص: ۱۷۱۔
۱۳۔ محمد اقبال، علامہ۔ کُلیاتِ اقبال (اُردو)، ص: ۳۷۔
۱۴۔ ایضاً، ص: ۵۸۲۔ ۱۵۔ ایضاً، ص: ۶۳۶۔ ۱۶۔ ایضاً، ص: ۹۱۳۔
۱۷۔ ایضاً، ص: ۸۱۲۔ ۱۸۔ ایضاً، ص: ۶۸۶۔


❖❖❖